کیا۔ پھر اُس نے بندوق والا ڈبا اُٹھایا اور کمرے سے نکل کر کھڑکی جانب چل پڑا۔

جب اُس نے یاسمین کی کھڑکی پر تین بار اُنگلی بجائی تو اسد کا جسم پُرسکون تھا، سانس کی گرانی غائب ہو چکی تھی۔ تیسری بار کھڑکی بجانے پر اندر لیمپ جلا، اور یاسمین نے کنڈی اُتار کر پٹ کو ایک درز کھولا، پھر جلدی سے کھڑکی کھول دی۔

"اسدی!"

اُس اندھیرے میں بھی اسد کو اُس کی آنکھوں کی چمک اور بالوں کی ایک ڈھیلی سی لٹ نظر آئی۔ یاسمین کا بدن بہت مدھم مدھم —— تندوری روٹی کی سی تنخیری مہک چھوڑ رہا تھا۔ اسد کے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ کاش وہ کچھ کہے سُنے بغیر، کوئی جواب دیے بغیر اس کھڑکی کے راستے داخل ہو کر اُس گرم بستر میں گھس جائے اور اپنے آپ کو اُس چارخانے کھیس سے ڈھانپ لے اور کبھی وہاں سے نہ نکلے۔

"دروازہ کھولو۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تم دروازہ کھولو۔"

یاسمین کچھ دیر تک اُسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر کھڑکی بند کر کے اندر چلی گئی۔ اسد دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ جب یاسمین نے کنڈی اُتاری تو وہ دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

دروازے کے اندر رُک کر اسد نے لبوں پر اُنگلی رکھ کر چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور یاسمین کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ یاسمین اُس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ کیا ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"یہ تو بندوق کا ڈبا ہے۔"

"ہاں۔" اسد نے جھک کر ڈبے کو یاسمین کی چارپائی کے نیچے دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

یاسمین حیرانی سے کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ "یہ کہاں سے لائے ہو؟" اُس نے نیچی آواز میں پوچھا۔

"دیکھو۔" اسد نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے بات کرنے کی سعی کی۔ "جوتا پہنو۔"

"کیوں؟"

"جوتا پہن کر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں ؟ کیوں ؟" یاسین نے چونک کر سوال کرنے شروع کیے ، "کہاں چلوں ؟" اور کچھ ذہن میں نہ آنے پر اسد نے دوبارہ انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اُسے چُپ رہنے کی تاکید کی ۔ "مطب میں" ۔ اُس نے کہا ۔

"کس لیے ؟" وہ بولی ۔ پھر یکلخت اُس کی آواز میں ہراس کی سرک پیدا ہوئی ، "ابا ——" اُس نے نیچی سی آواز میں پوچھا ۔ پھر زور سے بولی ، "ابا کہاں ہیں ؟"

"مطب میں ہیں ۔"

"وہاں کیا کر رہے ہیں ؟"

"کچھ نہیں ،" وہ بولا ، "ایک حادثہ ہوگیا ہے ۔"

"حادثہ ؟ کیسا حادثہ ؟ کیا ہوگیا ہے ؟ اسد ی ؟" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پلٹ کر کمرے سے نکل بھاگی ۔ اسد نے اُس کی ایک ڈھیلی سی لٹ دروازے میں اُڑتی ہوئی دیکھی ، پھر وہ صحن کو پار کر کے اندھیرے میں غائب ہو گئی ۔

"یاس ۔" اسد اُس کے پیچھے لپکا ، "میری بات سنو ۔ یاس ، میرے ساتھ چلو ۔"

وہ اُس کی بات سُنتی نہ سُنتی ہوئی ، بازو ہوا میں اُٹھائے ، لمبی لمبی نازک ٹانگوں والے پرندے کی مانند چھوٹے بڑے پتھروں کے اُوپر ننگے پاؤں اُڑتی چلی گئی ۔

مطب کے دروازے پر یاسین نے دونوں ہاتھوں سے چوکھٹ پکڑ کر اپنے آپ کو روکا اور جیسے زمین میں گڑ گئی ۔ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُس نے اندر کا منظر دیکھا اور لاعلمی سے مڑ کر اسد پر ایک سرسری سی نظر ڈالی ۔ پھر اُس نے کمرے میں ایک قدم رکھا اور ذرا سا جھک کر ، بے سمجھ نظروں سے لاش کو دیکھنے لگی ۔

"ابا ——" اُس نے ہولے سے بُلایا ، "ابا ۔"

پھر اُس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی ، جو کچھ کچھ جانوروں کی بھوک کے مارے ہوئے بھیڑیوں کی کُرک سے مشابہ تھی —— ایک گہری ، پیٹ سے اُبھرتی ہوئی غیر انسانی سی آواز جو نہ چیخ تھی نہ پکار بلکہ وحشت سی دہشت تھی ۔ ایک لحظے کو وہ بازو پھیلائے اسد کی طرف مُڑی ، جیسے اُس کے جسم میں پناہ لینا چاہتی ہو ، پھر پلٹ کر اپنے باپ کے اوندھے بدن پر جُھک گئی ۔ چوپایوں کی مانند چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتی ، مُردہ جسم کو روندتی ہوئی ، سر کی طرف جا کر ، وہ زمین پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی ۔ آہستہ سے اپنے باپ کا سر ہاتھوں میں لے کر اُس نے اپنی گود میں رکھا ، اور اُس کے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں کو مٹھیوں میں پکڑنے کی کوشش کرنے لگی ۔ منہ سے نکلے ہوئے خون کے بلبلے کو اُس کی سفید شلوار نے ڈھک دیا تھا ۔ اسد کا جی کیا کہ وہ شلوار کے کپڑے کو اُس جگہ سے اُٹھا کر پرے کر دے ۔

کسی سوگوار جانور کی طرح حلق سے لگاتار پیچی نیچی، گہری آوازیں نکالتے ہوئے وہ اپنی مٹھیاں سر کے بالوں پر کھولتی اور بند کرتی رہی۔ پھر وہاں کوئی آسرا نہ پاکر اُس نے اپنے کان ہاتھوں سے ڈھانپ لیے اور منہ اٹھا کر چیخ پر چیخ مارنے لگی۔ اسد ایک ہاتھ اُس کے بازو پہ، ایک سر پہ رکھے تختے پہ بیٹھا تھا اور احمق پن سے دُہرائے جا رہا تھا:

"یاس، کوئی بات نہیں —— چُپ کر و، یاس، کوئی بات نہیں ——"

باہر احاطہ گاؤں کے لوگوں سے بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ بڈھے، جوان، عورتیں اور بچّے، ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں لیے احاطے کی دیوار پھاند پھاند کر جمع ہو رہے تھے۔ مجمعے میں کہیں کہیں کلہاڑے چمک رہے تھے۔ کچھ بچّے زور زور سے رونے لگے تھے۔ وہ سب کمرے سے چند قدم پر نیم دائرے کی شکل میں ایک حد بنا کر کھڑے تھے۔ سب سے آگے چند ادھیڑ عمر کسان تھے جو بازو پھیلا پھیلا کر لوگوں کو آگے آنے سے روک رہے تھے۔ لالٹینوں کی روشنی میں اُن کے مخفی ہڈیوں والے چہرے خوابیدہ اور جذبات سے عاری تھے۔ اُن کی آنکھیں کھوپڑی کے اندر لگی تھیں جہاں وہ لڑکی، جس کو کسی نے لڑکپن کے بعد آج تک چادر کے بغیر نہ دیکھا تھا، چہرہ پاگل کیے منہ پھاڑ کر رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ کہتی جا رہی تھی، اور اسد اُس کو پکڑ کر بیٹھا بے سُود گردان کیے جا رہا تھا: "کوئی بات نہیں، یاس، چُپ کر جاؤ، کوئی بات نہیں" —— وہ زندگی کی سختی کے عادی چہرے، روزمرہ کے انداز میں ایک دُوسرے سے کہہ رہے تھے: "قتل ہو گیا ہے۔" "مر گیا ہے۔" صرف اُن کی عورتیں آپس میں اِس قتل پہ چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ اُس وقت مجمعے میں ایک معمولی سی ہلچل پیدا ہوئی اور سات معتبر بڈھے لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رُکے اور ایک دُوسرے پر گرتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ لڑکی اپنے باپ کے مُردہ جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اُس کی شلوار پر خون کے بڑے بڑے دھبّے تھے اور اُس کا ایک ہاتھ لاش کی پُشت پر قمیض کے چیر کو ڈھانپے ہوئے تھا، جیسے خون کا بہاؤ بند کرنے کو رکھا ہو، ہر چند کہ خون بہنا بند ہو چکا تھا۔ یاسمین کا دُوسرا ہاتھ اُس ننّھی ہوئی گردن پہ تھا اور منہ سفید سر پہ رکھے وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اسد اُس کے کندھوں کو پکڑے نیم دلی سے بار بار اُسے اُوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنی اُس احمقانہ گردان کو روکنے سے قاصر تھا۔ آخر کار اُس نے یاسمین کی بغلوں میں ہاتھ دے کر کر کے لپٹے زور سے اُسے اُوپر اٹھایا اور یُوں اُس کو لاش سے جُدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک بازو یاسمین کی کمر کے گرد ڈال کر وہ اُسے دروازے کی طرف لیے جا رہا تھا کہ یاسمین کی نظر کمرے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے چھ بڈھوں پر پڑی۔ ساتواں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ دفعتاً وہ اسد کے بازوؤں میں اس زور سے اچھلی کہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اسد کو دونوں ہاتھوں سے دروازے کے پٹ کا سہارا لینا پڑا۔ یُوں اپنے آپ کو اسد کے ہاتھوں سے آزاد کرا کے وہ للکارتی ہوئی بھاگی اور پہلے بڈھے کے اوپر

جاگری۔ اس اچانک حملے سے وہ بڈھا دوسروں پر گرا، اور دوسرا تیسرے کے اُوپر۔ آخر چوتھے اور پانچویں بڈھوں نے مل کر اُن تینوں کو سہارا دیا۔

یاسمین نے بڈھے کے سینے پر مکّوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"قاتل۔" وہ دہاڑی۔ "قاتل دو — قتل کر دیا ہے۔ اہا آآآ ——"

اُس نے بڈھے کی داڑھی دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اُسے نیچے کو کھینچا۔ اور جب بڈھے نے مدافعت کی تو وہ داڑھی پکڑے پکڑے، بے شرمی سے اُس کی رانوں اور پیٹرو میں گھٹنے مارنے لگی۔ بڈھا درد کے مارے دہرا ہوتے ہوتے گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور اُس کی ٹوپی زمین پر گر گئی۔ اسد نے یاسمین کی کمر میں دونوں بازو ڈال کر اسے اُوپر اٹھایا اور کچھ اٹھاتا، کچھ گھسیٹتا ہوا اُسے دروازے کی طرف لے چلا۔ دروازے کے باہر لوگوں کو دیکھ کر اُس بے قابو لڑکی کے حلق سے ایک ایسی خوفناک، حیوانی سی آواز برآمد ہوئی کہ جس نے اُن پتھریلے چہروں والے سخت کوش کسانوں کے مجمعے کو بھی چونکا دیا۔

"دہقان۔" اُس نے کہا، "بے ایمان دہقان۔" اور آخری بار ایک جھرجھری سی لے کر اسد کے بازوؤں میں ڈھے گئی۔ اُس کا سر چھاتی پر ڈھلک گیا اور بدن شل ہو گیا۔ باہر خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سانس کی آواز آتی تھی۔

ایک بڈھے نے آ کر اسد کے کان میں کہا: "اسے گھر کے اندر لے جاؤ۔" اسد نے اُس بھاری، بے ہوش جسم کو بمشکل کندھے پر اٹھایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ مجمعے کے اندر اس تیزی سے اُن کے لیے راستہ بنا کر ایک لحظے کو بھی اسد کو رکنا نہ پڑا۔ وہیں کہیں سے گھر میں کام کرنے والی حکیم کی قدیم خادمہ بھی، اُونچی آواز میں روتی اور فریاد کرتی ہوئی، دونوں ہاتھوں سے یاسمین کے لٹکتے ہوئے سر کو تھامے، اسد کے پیچھے ہو لی۔ یاسمین کو چارپائی پر ڈال کر اسد نے عورت سے دُودھ گرم کرنے کو کہا۔ پھر اُس نے افیون کے مُرکّب کی سیاہ گولیاں جن سے وہ واقف تھا، گھر میں سے ڈھونڈ کر نکالیں اور دو گولیاں گرم دودھ میں حل کیں۔ جب کچھ دیر کے بعد یاسمین میں ہوش کے آثار پیدا ہونے لگے تو اسد نے ایک بازو اُس کی پشت کے نیچے ڈال کر اُسے اُٹھایا، اور دُودھ کا پیالہ یاسمین کے مُنہ سے لگا دیا۔ اسد کے اشارے پر بوڑھی عورت نے اُس کا مُنہ کھول کر رکھا، اور اسد نے تھوڑا تھوڑا کر کے دُودھ اُس کے حلق میں اُنڈیلنا شروع کیا۔ کچھ دُودھ نیچے گرا، باقی یاسمین کے حلق سے اُتر گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

اسد چارپائی کے پاس دیوار کی اُس بھدی سی کُرسی پر بیٹھا تھا جو اُس نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ کمرے میں ایک دوسری، چوڑی سی آرام کُرسی بھی تھی جس پر وہ پہلے بیٹھنے ہی والا تھا کہ اُسے باہر، اُس دُوسرے کمرے میں اُوندھے منہ پڑا ہوا مُردہ جسم یاد آگیا اور وہ اُس کُرسی سے پرے سرک گیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے سے جا کر یہ سخت تختے کی سیٹ والی کُرسی اُٹھا لایا تھا جو اُس نے سردیوں میں، احمد علی کے بھائی سے اوزار مانگ مانگ کر گیارہ دن میں، اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ یاسمین اپنے باپ کے بستر میں لیٹی تھی۔ اسد دراصل یاسمین کو اُٹھائے اُس کے کمرے میں لیے جا رہا تھا کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اُس کی سانس پھُول گئی اور ٹانگیں تقریباً جواب دے گیئں۔ چنانچہ وہ جلدی سے اسی کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ یاسمین کو دُودھ پلانے اور کمبل سے ڈھکنے کے بعد اسد نے سوچا تھا کہ اگر وہ اپنے کمرے میں چلا جائے اور جا کر سو جائے تو کیا حرج ہے؟ عورت گھر میں موجود ہی ہے۔ مگر یاسمین نے نیند میں کراہنا شروع کر دیا تھا۔ گہرے نشے کی نیند میں وہ وقفے وقفے پر شیشے کی سی آنکھیں کھولتی، پھر بند کر لیتی۔ اُس کا لمبا، ہڈیوں کی سوکھا جسم کمبل کے اندر مسلسل حرکت میں تھا۔ وہ کسمساتی، جھرجھراتی، اور کراہنے لگتی۔ اسد وہاں سے اُٹھ کر نہ جا سکا۔ اب وہ اپنی کُرسی پہ بیٹھا خالی خالی نظروں سے یاسمین کو اور اِدھر اُدھر کمرے کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کی سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پہ ٹھیک اُسی طرح رکھی تھیں جیسے ہمیشہ رکھی رہتی تھیں۔ حکیم ایک بانظم آدمی تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو اپنی مخصوص جگہ پر رکھنے کا عادی تھا۔ اُس کی چھڑی، جس پر کھدائی کا باریک کام کیا ہوا تھا، بادام روغن کی شیشی، لکڑی کا کنگھا (جسے وہ اکثر، موقع بے موقع اُٹھا کر اپنے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں میں، تالوُ سے شروع کر کے سیدھا ماتھے کی طرف پھیرا کرتا)، شیشہ، خشک مسواک کا بنڈل، صندل کی لکڑی کے دانوں والی تسبیح، سُرمے کی ننھی سی بوتل اور سُرمچو، اس کا لوٹا، جائے نماز، کپڑے کی چوکور ٹوپی (یہ پہلی بار تھی کہ حکیم اپنی ٹوپی گھر میں چھوڑ کر باہر گیا تھا)، موٹی اُون کی جرابوں کا جوڑا، اور اس کے علاوہ کپڑوں کے چند جوڑے جو اُس کے ٹین کے پُرانے بکس میں پڑے تھے۔ کُل یہ چیزیں تھیں جو اُس کی ملکیت تھیں۔ حکیم سادہ آدمی تھا۔ اور نفیس۔ بندوق پر زنگ کا نشان تک نہ تھا، گو برسوں سے استعمال میں نہ آئی تھی، مگر دیسی گھی کی دیسی جھاڑی پونچھی اور تیل لگی چمکتی ہوئی ڈبے میں بند پڑی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ حکیم ہر چند ماہ کے بعد باقاعدگی سے اسے نکال کر صاف کرتا تھا۔ اگر لڑکے کے ہاتھ میں ہوتی تو کوئی تُک بھی تھی۔ وہ اسی مقصد سے آیا تھا، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسد کو دن کے وقت ہی پتا چل گیا تھا کہ لڑکے کی آنکھوں میں خون ہے، جس طرح سے وہ بھاگ کر باہر نکل گیا تھا اور جیسے اُس نے دوا کے گرنے کی پروا بھی نہ کی تھی۔ مدقوق حرامی، قتل کے ارادے سے آیا تھا، قتل کر کے گیا۔ اُس کو مگر یہ علم کیسے ہوا تھا کہ حکیم رات کے اس وقت مطب میں آئے گا؟ چھپا رہا ہو گا۔ مگر یہ اُس کو کیسے پتا تھا کہ حکیم آدھی رات کے وقت وہاں آئے گا؟ حکیم تو اُس وقت کبھی وہاں اکیلا نہیں آتا ـــــ

پھر وہ گھر کے باہر چھپ کر انتظار کرتا رہا ہوگا۔ تو کیا اُس کا گھر میں نقب لگانے کا ارادہ تھا؟ اونہوں، اسد نے اس کی تردید کی۔ یہ تو اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر وہ گھر کے باہر بیٹھا تھا تو اُس نے یاسمین کو باہر جاتے تو دیکھا ہوگا؟ ضرور دیکھا ہوگا۔ کیا اُس نے پتا چلایا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اور خود اسد کو؟ کیا اُسے بھی یاسمین کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا؟ خدایا! اسد نے سوچا، رات کے شروع میں، جب وہ سنسان گلیوں سے گزر کر جا رہا تھا تو اُسے خیال ہوا تھا کہ جیسے رات کے اندر کوئی ذی رُوح نہ بستا ہو ما سوا اُن دونوں کے، اور سارا وقت یہ دو چمکتی ہُوئی مکار آنکھیں اُن کا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ بھُوری آنکھیں۔ گول پندرہ آنکھیں۔

بہرحال، جب یاسمین نکل کر چلی گئی تو دروازہ کُھلا رہ گیا تھا۔ اُس وقت وہ آسانی سے اندر گھُس کر اپنا کام کر سکتا تھا۔ چپکے سے حکیم کے کمرے میں پہنچ کر اُس کا کام تمام کرتا اور یاسمین کی واپسی سے پہلے دروازہ بھیڑ کر اپنے گھر کو بھی چلا جاتا، اور صبح ہونے تک کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ پھر؟ پھر کیوں وہ یہاں چھُپا حکیم کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ باہر آیا تو اُس کے پیچھے پیچھے مطب میں گیا اور وہاں جا کر اُس پہ وار کیا بتی کی روشنی میں جہاں کوئی بھی اندھیری رات میں گزرتا ہُوا اُسے دیکھ سکتا تھا؟ اونہوں! اسد نے دوبارہ اپنے دل میں اس خیال کی تردید کی۔ میر حسن یہاں آیا ہی نہیں۔ وُہ سیدھا مطب میں پہنچا، اور شاید قتل کے ارادے سے نہیں بلکہ بندوق چرانے کی غرض سے گیا تھا۔ ہاں یہ بات ہو سکتی ہے۔ مگر بندوق حکیم کے ہاتھ میں تھی۔ اوّل حکیم اُس وقت بندوق کو اپنے ہاتھ میں لیے وہاں کر کیا رہا تھا؟

بستر میں لڑکی نے ہلنا اور کراہنا شروع کر دیا تھا۔ اسد اُٹھ کر چارپائی کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ یاسمین کے حلق سے گہری درد کی لمبی لمبی، مدھم آواز نکل رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے کروٹ لی اور آواز ہلکی ہلکی سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ پھر اُس کا جسم خاموش ہو گیا۔ اسد واپس آ کر کُرسی پہ بیٹھ گیا۔ یہاں تک تو بات عیاں تھی کہ میر حسن ہتھیار اٹھانے کی غرض سے آیا تھا۔ کسی کے کہنے پہ آیا تھا یا خود آیا تھا، مگر آیا اسی مقصد سے تھا اور غالباً شروع رات سے چھُپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے، اسد نے اپنا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی، ٹھیک کس وقت آیا تھا اس سے غرض نہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ یہاں نہیں بلکہ وہاں آیا تھا۔ وہ رات پڑنے کے انتظار میں چھُپ کر بیٹھا رہا تھا۔ مگر جب اُسے پتا تھا کہ رات کے وقت اس گاؤں میں کوئی باہر نہیں نکلتا اور حکیم تو کبھی اس وقت باہر نہیں آیا جب تک کہ کوئی مریض نہ آ پہنچے، پھر اُسے آدھی رات تک انتظار کس بات کا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ کسی سوچی سمجھی تجویز کے مطابق نہیں بلکہ محض وقتی جذبے کے تحت آ گیا ہو اور وہاں اسی شش و پنج میں بیٹھا رہا ہو کہ کرے تو کیا کرے۔ آخر کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں۔ یہی بات ہے۔ وہاں بیٹھا جُز بز ہو رہا ہوگا کہ حکیم کسی نہ کسی غرض سے مطب میں آیا اور بندوق کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ بندوق کو اُلٹ پلٹ کرنے کا کیا مطلب تھا آخر؟ یہ ایک معمہ

ہے۔ نہیں کوئی ایسا معمہ بھی نہیں۔ کوئی بھی مقصد ہو سکتا تھا۔ آخر اُس کی اپنی بندوق تھی۔ صاف وات کرنے کو ہی نکالی ہو گی۔ بندوق پر زنگ کا نشان تک نہ تھا، یوں جیسے باقاعدگی کے ساتھ ...... اپنے ذہن کو جھٹکتے پا کر اسد نے سر جھٹکا، لڑکے کے بارے میں سوچو، اُس نے اپنے آپ کو تنبیہ کی، ذہن کو مرکوز رکھو، اِدھر اُدھر مت دوڑنے دو۔ آخر تمہیں یہ سب کچھ بتانا ہے۔

کیا میر حسن حکیم کے واپس جانے تک کا انتظار نہ کر سکتا تھا؟ ٹھیک ہے۔ اُس نے حکیم کے واپس جانے تک رُکنے کا فیصلہ کر لیا، مگر اُس کے دل میں کھُد بُد لگی رہی کہ حکیم اس وقت کرنے کیا آیا ہے، چنانچہ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے تک آیا اور اندھیرے میں چھُپ کر دیکھنے لگا۔ اُس وقت اُس نے دیکھا کہ حکیم بندوق ہاتھ میں لیے اُسے جوڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اُسے گھر میں لے جانے کے لیے آیا تھا، اور بندوق ایک بار گھر میں چلی جاتی تو پھر وہاں سے اُس کا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اِتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی اور تدبیر لڑاتا، چنانچہ وہ اندر داخل ہوا، اور پھر وہ ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا۔ حکیم کو مار گرانے کے بعد ایک نظر ڈالنے کے لیے باہر نکلا اور بندوق حاصل کرنے کے لیے واپس اندر گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسد اتفاق سے وہاں سے گزر رہا تھا اور اُس نے پہلی بار میر حسن کا سایہ دیکھا تھا۔ پھر کیوں میر حسن نے بندوق نہ اٹھائی؟ شاید کوشش کی ہو مگر چھڑا نہ سکا ہو، یا شاید گھبرا گیا ہو، کیونکہ ہو سکتا ہے اُس کا ارادہ حکیم کو قتل کرنے کا نہ ہو بلکہ اُسے چوٹ لگا کر گرانے یا زیادہ سے زیادہ بیہوش کرنے کا ہی ہو، اور جب اُس نے دیکھا کہ اُس نے تو حکیم کا خون ہی کر دیا ہے تو گھبرا گیا ہو، اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اب کیا کرے (سوائے اس کے کہ باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھے اور واپس اندر چلا جائے)۔ ٹھیک۔ یہ بات کچھ ٹھیک لگتی ہے۔ اسد نے ایک لمبی سانس لی، جیسے کہ اس معمے کے حل کی کوئی صورت نکلتی آ رہی ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے واقعات کی صورتیں پھر یلغار کرتی آنے لگیں۔

تو کیا کسی کو بیہوش کرنے کے لیے اُس کی پُشت میں خنجر بھونک دیا جاتا ہے؟ اونہوں۔ بیوقوفی کی بات ہے۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ پُورے ارادۂ قتل سے آیا تھا اور اُس نے واردات کی۔ ٹھیک ہے، اُس نے قتلِ عمد کیا مگر آخر ایک لڑکا ہی تو ہے۔ جب اُس نے ایسا وار کیا کہ حکیم کو فی الواقع زخمی ہو کر گرتے اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گیا۔ آخر ایک نوعمر لڑکا ہی تو ہے ...... اُس وقت وہ کمزور سی آواز جو بازگشت کی مانند اسد کے دماغ میں مستقل چکرکاٹ رہی تھی، خیالات کے اِس جھنجھٹ کو توڑ کر آگے نکل آئی، اور اُس کے ساتھ ہی وہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا: سُتا ہوا زرد چہرہ، خوف سے اُبلی ہوئی زرد آنکھیں، اور کانپتے ہوئے

ہونٹ ، کھلتے اور بند ہوتے ہوئے ، آخر کہتے ہوئے : "تم نے کچھ نہیں دیکھا ۔ میں تو آیا ہی ہوں ۔"
یہ تھے وہ الفاظ جو اُس کو بار بار مجبور کر رہے تھے کہ وہ ہر بات کو اُلٹے اور پلٹے ، اُن کا کھوج نکالے ، اُنہیں پرکھے ۔ وہ باتیں جو اوّل اوّل سیدھی سادی معلوم ہوتی تھیں ، جیسے جیسے وہ سوچتا اُس کی اُنگلیوں سے ہوا کی طرح نکلتی جا رہی تھیں ۔ اُس کی نظر گدلی ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا ۔ ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ہونا بہت ضروری تھا ۔ اب وہ اِس جھنجھٹ میں پھنس ہی چکا تھا ، جتنا بھی ہاتھ پاؤں مارتا اس سے نکلنا دشوار تھا ۔ اس وقت تو وہی ، تنِ تنہا ، اِس معاملے میں پھنسا ہوا تھا ، اسد نے افسوس کے ساتھ سوچا ۔ میں نے کتنی بیوقوفی کا ثبوت دیا ہے ۔ چاہیے یہ تھا کہ چپکے سے جا کر اپنے کمرے میں سو رہتا ۔ ان لوگوں کو خود ہی یہ قضیہ نبٹانے دیتا ۔ اب سارے گاؤں کے علم میں آ چکا ہے کہ میں ہی ایک آدمی ہوں جو موقعے پر موجود تھا اور جو اصل بات بتا سکتا ہوں ، اور کوئی نہیں ۔ یہ سوچ سوچ کر ابھی تک اسد کو صرف ایک بات کا علم ہو سکا تھا : کہ اب کتنی باتوں کا ، کتنی چیزوں کا انحصار اُس ایک آدمی پہ ہے ، اور اِس وجہ سے کتنا ضروری ہو گیا ہے کہ وہ جو بات کرے وہ درست ہو ۔ وہ اس ذمہ داری کے احساس سے کانپ اُٹھا ۔ اسد پہ اب آہستہ آہستہ اِس بات کا اِنکشاف ہونے لگا تھا کہ کسی ایسے معاملے میں پھنسنا کیا ہوتا ہے جس میں بات بات پہ فریب کا احتمال ہو ۔ اصل بات کسے کہتے ہیں ؟ میں کتنا احمق ہوں ، اس نے جھلا کر اپنے آپ کو کوسا ۔ مگر ساتھ ہی اس اَن دیکھے احساس نے اُسے ہر اُس بات کو جو اُس نے دیکھی تھی ، اپنے ذہن میں پرکھنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ آخر یہ قصہ کیا تھا ؟ آلۂ قتل ! ہاں ، آلۂ قتل کہاں تھا ؟ آلۂ کار ......

یاسمین کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اُس نے بستر پر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے ۔ وہ اپنے پاؤں یوں اُٹھا اُٹھا کر رکھ رہی تھی جیسے من من بھر کے ہوں ۔ اسد کو یوں لگا جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہا ہے جس کی دو تہیں ہیں ۔ اُوپر کی سطح پر ہر شے کی رفتار غیر قدرتی طور پر سست ہو گئی ہے اور نچلی تہہ پر غیر معمولی طور پر تیز ! پتلا سفید کھیس اکٹھا ہو کر یاسمین کے اُوپر سے کھسک گیا تھا اور خون کے دھبوں والی سفید شلوار گھٹنوں تک سرک آئی تھی ۔ اسد نے جھک کر یاسمین کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔ یاسمین نے خواب میں آنکھیں کھولیں اور بند کر لیں ۔ شلوار اور کھیس ٹھیک کرنے سے پہلے اسد کی نظر اُن سرتیا رنگ کی لمبی لمبی پنڈلیوں اور پیازی ٹخنوں کی مدھم سی گولائیوں پر پڑی اور وہ ایک لمحے کو ٹھٹک کر رُک گیا ۔ پھر وہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا ۔

آلۂ قتل ۔ خنجر ۔ کہیں بھی ہو سکتا تھا ۔ چوکی کے نیچے یا کہیں اور ۔ اگر وہ اُس وقت اپنے ہوش قائم رکھتا اور اِدھر اُدھر تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو اُسے شاید کہیں پڑا ہوا مل جاتا ۔ چوکی کے نیچے یا کہیں اور ۔ تختے کے نیچے دیکھا تو تھا صرف قینچی پڑی تھی ،

بس ۔ یہ ایک اور احمقانہ بات ہے ۔ بھلا قتل کا ہتھیار بھی کوئی پھینک کے جائے گا ؟ وہ تو قاتل کے پاس ہوگا ، اُس کی حفاظت میں ، نیفے میں اُڑسا ہوا یا کہیں اور ، جہاں سے پھر وہ اُسے کسی چوٹی پر جاکر دُور نیچے کسی بل میں پھینک دے گا جہاں عمر بھر اُس پہ کسی کی نظر بھی نہ پڑے گی ۔ مگر خون ! ہاں ، خون کہاں تھا ؟ روشنی اُس وقت کافی تھی جب اُس نے میر حسن کو دیکھا تھا ، اُس نے میر حسن کو صاف طور پہ دیکھا تھا ، پھر جب وہ بھاگا تھا تو اُس کی پُشت بھی نظر آئی تھی اور میر حسن پہ خون کا دھبّا تک نہ تھا ، جب کہ صاف ظاہر تھا ۔ زرد کھدّر کے تخت پوش پہ خون کے قطروں کی قطار تھی اور صاف ظاہر تھا کہ جہاں خنجر گھُسا تھا وہاں سے خون اُچھل کر نکلا تھا ۔ پھر میر حسن کیسے اس سے بچ سکتا تھا ؟ روشنی اُس وقت کافی تھی اور اُس نے صاف دیکھا تھا ۔ "مَیں تو آیا ہی ہوں" اس بے سُود فریاد کی آواز اسد کے دماغ میں آکر بجنے لگی ، "مَیں تو آیا ہی ہوں ۔" جیسے دُور سے ریل گاڑی کی کُوک کی آواز تیزی سے قریب آتی جاتی ہے اور کانوں میں شور مچا دیتی ہے ۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگا ۔ اپنی انگلیوں کو دانتوں سے نوچ نوچ کر اور مُٹھیاں دیواروں پہ مار مار کر اُس نے اپنے ہاتھ سُرخ کر لیے ۔ میر حسن کو بھلا یہ ہتھیار استعمال کرنا آتا تھا ؟ کیونکہ جو کچھ بھی تھا ، کم سے کم ایک بات صاف ظاہر تھی کہ وار بڑی مہارت سے اور کاری لگایا گیا تھا ، اس طرح کہ بڈھے کو مدافعت کرنا تو درکنار ، پیچھے مڑ کر اپنے قاتل کو دیکھنے کا موقع بھی نہ مِلا تھا ۔ وہ شاید آواز نکالے بغیر ، اُسی طرح اوندھے مُنہ گر کر ، یا شاید گرنے سے پہلے ہی ٹھنڈا ہوکر مر گیا تھا ۔ اُس بیچارے کو مہلت ہی نہ مِلی تھی ۔ میر حسن نے اس کاریگری سے خنجر استعمال کرنا کہاں سے سیکھا تھا ؟ آخر وہ ایک نوعمر لڑکا ہی تو تھا جو شاید اپنی عُمر میں اِس گاؤں سے بھی باہر نہ نکلا تھا —— یا یہ محض اتفاق تھا ؟ کہ خنجر والا ہاتھ اتفاقاً اس طور سے پڑا کہ زخم کاری آیا ؟ اُس وقت اسد کے دل میں شبہے کا بے معلوم سایہ نہ شک کی جڑ بن کر پھُوٹنا شروع ہوا ۔ کمرے میں اُس کے چکر تیز ہو گئے ۔ اُس کی انگلیوں کے جوڑوں سے خُون رِسنے لگا ۔ اُس ذہن کی افراتفری سے فرار کی سب راہیں مسدود پا کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اپنے آپ کو اِس جھمیلے میں ڈال کر وہ ایک ایسے مقام پہ آکھڑا ہوا تھا جہاں وہ سچائی کی تلاش پہ مجبُور ہو گیا تھا ۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا ۔ مہلت اتنی کم تھی اور اُسے جلد از جلد اپنے ذہن کی تصویر واضح کرنا تھی ۔ وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جو جی میں آئے کہہ دے ۔ یا اُس نے اپنے آپ سے کہا ، کِس مصیبت میں جان آئی ہے ۔ آج تک اُس نے کسی نہ کسی طور اپنے آپ کو ایسے جھمیلوں میں پڑنے سے بچائے رکھا تھا ۔ وہ ایک طرف کو کھڑا آرام سے دُنیا کا تماشا کرتا رہتا تھا اور اُس کا فاصلہ قائم اور حیثیت مستثنیٰ رہتی تھی ۔ مُہلت کی کمی نہ ہوتی تھی اور کوئی دُوسرا اُس کا شریک نہ تھا جس پہ اُس کے اعمال کا اثر پڑ سکتا تھا ۔ اُس نے سمجھ رکھا تھا کہ زندگی اُس کا ذاتی معاملہ ہے اور اُس کی ایک الگ ، ایک گواہ کی سی حیثیت ہے جو دُنیا کے راز و رُموز اپنی جان پہ درج کرتا ہے اور جلد یا بدیر اُس پہ حقیقت کا انکشاف ہوتا رہتا ہے ۔ اب یہ قضیہ ایک نئی صُورت

لے کردار دہرا تھا۔ اِس صورت سے وہ واقف نہ تھا۔ اب اسے پتا چلا کہ اصل گراہ کی جگہ اور حیثیت کیا ہوتی ہے۔ کہ یہ ایک بے خطر حیثیت نہیں بلکہ ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں اپنی ذات کی بنیادوں پہ شک ہونے لگتا ہے اور حاضر دماغی کے بڑا کچھ کام نہیں آتا۔ اُس کے ایک ایک لفظ پہ کسی دوسرے شخص کی زندگی کا انحصار تھا، اور اُس نے اِس ایک ایک لفظ کو عجلت میں کھرچ کر نکالا تھا، حقیقت کی شکل میں، مُمکنہ اور توجیہاً حقیقت کی شکل میں! اور حقیقت کیا تھی؟ حقیقت یہ تھی کہ اُس نے میرحسن کو جائے وقوعہ پر دیکھا تھا، مگر میرحسن نے کہا تھا، "تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں تو آیا ہی نہیں"۔ میرحسن وہاں پر کیوں آیا تھا، یہ تو بعد کی بات ہے۔ اصل بات تو تھی کہ اُس نے میرحسن کو قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تھی اصل بات!

تو یہ چکر کیسے رُونما ہُوا؟ کہ جو بات پہلے صاف اور سیدھی معلوم ہوتی تھی آخر میں بالکل ہی اُلٹ ہو کر سامنے آگئی؟ یعنی سہ پہر کے وقت میرحسن کا (آگ برساتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ) احاطہ چھوڑ کر بھاگ جانا، یُوں جیسے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ پھر جائے واردات پر اُس کی موجودگی، اور صرف اُسی کی موجودگی! پھر یہ شکوک و شبہات کیسے اور کب سر اُٹھانے لگے تھے؟ یا اللہ، واقعات کے بھی کیسے اسرار ہوتے ہیں! کاش کہ کوئی دوسرا اس قصّے میں اُس کا شریک نہ ہوتا اور وہ الگ کھڑا اس معاملے کو دُور سے دیکھ رہا ہوتا۔ پھر اطمینان سے کہیں بیٹھ کر وہ اِس معاملے کا لغو مطالعہ کرتا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کا ذہن شاید صاف ہو جاتا۔ اب مہلت نہ تھی۔

اتنا وقت گزر جانے پر بھی اسد کے دل میں ایک حسرت (اور ایک موہوم سی اُمید) ابھی باقی تھی کہ کاش کوئی تدبیر، کوئی ترکیب، کوئی معجزہ ایسا رونما ہو کہ وہ اس جھنجھٹ سے صاف چھٹکارا پا کر دُور ایک کنارے پر جا کھڑا ہو اور دُوسرے لوگوں کو اس سے نپٹتے، اِسے نبٹاتے ہوئے دیکھنے لگے گویا سیمن بھی اُس کے پہلو میں وہیں پر کھڑی ہو اور اُس کا اِس قصّے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نیچے ایک کمرے میں کوئی لاش پڑی ہو جسے وہ دونوں محض سرسری طور پر ہی جانتے ہوں۔ اسد کو کل صبح کا وقت یاد آیا جب وہ بہت سویرے، گہری نیند سے محض اپنے جسم کا لذیذ بوجھ لیے اُٹھا تھا اور اپنے روزمرّہ کے کام کے لیے نکل آیا تھا۔ اُسے کیا پتا تھا کہ یہ دن اِتنا طویل ہو گا! اب اس وقت اسد کو محسوس ہُوا، جیسے ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب وہ جس صورت بھی اس جھنجھٹ سے آزاد ہُوا، وہ باضابطہ اور بے خطر وقت اب کبھی لَوٹ کر نہ آئے گا۔ اب دُنیا بدل گئی تھی۔ اب ایک مہیب ذمّہ داری کا اور دماغ کی عسرت کا وقت تھا۔ اب مہلت نہ تھی۔ دو گھنٹے میں صبح ہو جائے گی، اور کیسی جابر صبح یہ ہو گی۔ کیا نجات کا کوئی رستہ نہ تھا؟

کوئی دُوسرا آدمی ! کیا کوئی دُوسرا آدمی بھی تھا؟ تھا تو کون تھا۔ کیا کوئی ہو بھی سکتا ہے؟" کسی اور نے کیا جو میرحسن نے کہا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو بات اُس وقت جلد جوئی اور سنیعد جھوٹ لگتی تھی آخر کو سچ پر ہی مبنی ہو؟ اور وہ بدبخت لڑکا فی الواقع وہاں محض آیا ہی ہو؟ خدایا!

اسد کے ذہن میں روشنی کا ایک جھپاکا سا ہُوا اور وہ لمبی سانس لے کر کرسی پر آ بیٹھا۔ پہلے مجھے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اُس نے سوچا۔ اپنے طور تو مجھے کسی بات کا کھوج لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ میرا فرض تو صرف اتنا ہے کہ جو کچھ مَیں نے دیکھا ہے حرف بحرف بیان کر دوں اور بس۔ مقتول وہاں مرا پڑا تھا اور لڑکا لاش کے گرد منڈلا رہا تھا جس وقت کہ اتفاق سے میرا گزر اُس طرف سے ہُوا اور موقعے پر پہنچ کر مَیں نے لڑکے کو پکڑ لیا، اور لڑکے نے کہا، مجھے پتا نہیں، مَیں نے نہیں کیا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر میرحسن نے کوئی اور کہانی گھڑنی ہے تو اُن کے رُوبرو گھڑتا رہے گا۔ اصل قاتل کا پتا لگانا تو اُن کا فرض ہے نہ کہ میرا۔ مَیں تو بس واقعات کو صاف صاف بیان کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتا ہوں۔ میرا ضمیر صاف ہو جائے گا۔

ضمیر! فرض! یہ الفاظ اُس کے ذہن میں بھاری پتھر کی طرح آ کر لگے۔ بیشک وہ اپنا قانونی فرض پُورا کر سکتا تھا، مگر کیا وہ اُس ذمّہ داری سے بھی عہدہ برا ہو سکتا تھا جو اُس پر عاید ہوتی تھی؟ اس لیے کہ اگر میرحسن نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا، اور وہ لڑکا، خود اُس کی طرح، محض اُس طرف سے گزرا ہی تھا، تو کیا یہ درست تھا کہ اُسے اُن کے حوالے کر دیا جائے؟ کیا یہ اُس کی ذمّہ داری نہ تھی کہ وُہ اس بات کا خیال کرے کہ اُس کے کسی ایک نادرست لفظ کی بنا پر لڑکے کو کوئی زک نہ پہنچے؟ اوّل میرحسن یہی کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ کوئی اور وہاں پہ تھا، یا پہلے آ چکا تھا جو اصل قاتل تھا نہ کہ وہ، کیونکہ اِس کا کوئی گواہ ہی نہیں۔ موقعے کا اکلوتا گواہ جو تھا وہ کہتا ہے کہ جب وہ پہنچا تو اُس نے لڑکے کو لاش کے پاس کمرے میں موجود پایا۔ میرحسن وہاں پر اپنی موجودگی کی کیا تاویل پیش کر سکتا ہے؟ یہ کہ مَیں تو آیا ہی تھا؟ جب کہ گواہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ میرحسن ہی تھا جو دن کے وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بدھوں کے پیچھے احاطے سے نکل گیا تھا۔ جہاں تک اُن کا تعلق ہے، کسی شک شبے کی گنجائش نہیں۔ سیدھا سادا کیس ہے۔ ہاں اگر وہ میرحسن کے احاطے سے بھاگنے کی بات و کرے تو کوئی حرج ہے؟ کسی بات کو حذف کر دینا کیا جھوٹ کے مترادف ہے؟ ہے بھی اور نہیں بھی۔ مگر اس سے کیا فائدہ؟ سب لوگوں نے دیکھا ہے۔ میرحسن کا نام نکلا تو ساری بات نکل آئے گی۔ پھر؟

اسد گھبرا کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کھڑکی کے پاس جا کر اُس نے ایک پٹ کھولا۔ باہر پَو پھٹنے سے پہلے کا گھُپ اندھیرا تھا۔ اُس نے پٹ بند کر دیا۔ اگلے چند منٹوں میں اُس نے کئی بار کھڑکی کھولی اور بند کی۔ اُس کے اندر اتری

کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے کوئی فیصلہ کرنا ہے، وہ بار بار کہتا، اور اُس پر عمل کرنا ہے۔ عمل! گرم گرم آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے اور اپنے پیچھے سرد ہموار راستے بناتے ہوئے گالوں سے ٹپک پڑے۔ بستر پر یاسمین نے ایک سسکی لی جو اسد کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ عمر میں پہلی بار اُس کے ہاتھوں میں یہ طاقت آئی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری اٹھا کر کسی اور کے سر پر ڈال دے، اور وہ اِس کے بوجھ تلے پسا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ سنا ہوا، ہلکے بخار سے چمکتی ہوئی آنکھوں والا چہرہ تھا جو کہے جا رہا تھا، تم نے کچھ نہیں دیکھا، میں تو آیا ہی ہوں۔ اُس کو علم نہیں تھا کہ یہ بات درست ہے یا غلط مگر فرار کا کوئی رستہ بھی نہ تھا۔

کھڑکی پر ماتھا ٹکائے، آنکھیں بند کیے، آہستہ آہستہ اسد کے اندر کی کیفیت سرد پڑنے لگی۔ بستر کے پاس جا کر یاسمین کے اوپر کپڑا ٹھیک کرنے کے بعد وہ آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی گردن میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ اُس نے سر کرسی کی پشت پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیمپ کی کانپتی ہوئی روشنی میں اُس کا بے حس و حرکت چہرہ زرد اور بیجان دکھائی دے رہا تھا، جیسے کہ رات بھر کی مدت میں ایک پورا موسم اُس کے اوپر سایہ ڈال کر گزر گیا ہو۔ ایک انوکھی سی خاموشی اب اُس کے اندر سرایت کرتی جا رہی تھی، جو اُس کے بدن کو آرام پہنچا رہی تھی۔ اُس نے چند مختصر سے اڑتے ہوئے خواب دیکھے۔ آدمیوں کی ایک قطار، ایک پرانے پسندیدہ گیت کا ٹکڑا، ہوا میں تیرتی ہوئی لمبی لمبی سفید پنڈلیاں۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کی گردن میں بل پڑ چکا تھا۔ کان کے نیچے ہڈی پر گہرا سرخ نشان پڑ گیا تھا جہاں پر گردن کرسی کی پشت پر رکھی رہی تھی۔ سوتے میں اُس کا منہ کھلا رہا تھا جس سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، مگر کھڑکی کی درزوں سے آسمان کو دیکھ کر اسد نے اندازہ کیا کہ دن نکل آیا ہے۔ یاسمین گہری نیند سو رہی تھی۔ باہر نکل کر اسد نے کلی کی۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ باورچی خانے میں جا کر اُس نے رات کی بچی ہوئی روٹی کا ٹکڑا ایک پیالہ بھر تازہ اُبلے ہوئے دودھ کے ساتھ کھایا۔ اُسے دیکھ کر بوڑھی عورت جو زمین پر خاموش بیٹھی تھی، آنکھوں پہ کپڑا رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگی۔ روٹی چباتے چباتے اسد نے اُسے بتایا کہ یاسمین آرام سے سو رہی ہے اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ کھانا ختم کر کے وہ کچھ دیر تک دیگچی میں اُبلے ہوئے دودھ کی سطح پر بے شمار ننھے ننھے قطروں کی موٹی سی تہہ کو دیکھتا رہا۔ اِس سے اُس کی آنکھوں کو آرام ملا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ کھڑکی میں جا کر احاطے پر ایک نظر ڈالے، مگر اُس کے پیٹ میں ککڑیوں کی سی بھاری بدمزگی کی لہر اُٹھنے لگی۔ واپس جانے سے پہلے اسد نے نظر بھر کر اُس منہ ڈھکے عمر رسیدہ جسم کو، ہچکولے کھا کھا کر اپنے نقصان کو یاد کرتے ہوئے دیکھا۔ پچیس برس پہلے جب یہ اِس گھر میں آئی تھی، اسد نے بے خیالی سے سوچا، نوجوان عورت ہوگی۔ محنت اور بے زبانی ہی شاید اس زندگی کی پائے داری کا راز تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

یاسمین نے جب آنکھیں کھولیں تو سورج چوٹی سے نکل کر اوپر آچکا تھا اور کھلی کھڑکی میں سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ اس سے کچھ ہی دیر کے بعد پولیس کی پارٹی، جو سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل (محرر) اور دو رائفل بردار کانسٹیبلوں پر مشتمل تھی، گاؤں میں وارد ہوئی۔ گاؤں کا ایک معتبر اور دلی چوکیدار، جو رات ہی قتل کی اطلاع دینے تھانے کو روانہ ہو چکے تھے، اُن کے ہمراہ آئے۔ پٹواری کے گھر سے ایک میز اور کرسی لاکر مطب کے احاطے میں رکھی گئی۔ گاؤں بھر میں اوّل نمبر کی تین چارپائیاں، سفید سُتلی کی بنائی اور رنگ دار پایوں والی، لاکر پاس بچھائی گئیں۔ ایک کانسٹیبل نے سیاہ ٹین کا صندوق میز پر رکھ دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل محرر نے چابی لگاکر اُسے کھولا، اور اندر سے ایک رجسٹر نما کاپی نکال کر میز پر رکھی۔ پھر اُس نے چار مختلف لمبائیوں کی پنسلیں نکالیں، اور اُن کے سکّوں کو آہستہ آہستہ میز کی سطح پر رگڑنے کے بعد صندوقچے کے ایک خانے میں کھڑی کر دیں۔ (بعد میں، اُن کی تمام تر کارروائی کے دوران ان میں سے صرف ایک پنسل استعمال ہوئی۔) تھانیدار نے، جو چالیس کے لگ بھگ تیز آنکھوں والا پتلا دُبلا آدمی تھا، سب سے پہلے مطب میں پہنچ کر لاش کا اور جائے واردات کا تفصیلی معائنہ شروع کیا۔ ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں فیتا تھا، جس کی مدد سے وہ لاش کا حدود اربعہ، زخم کا طول وعرض اور محلِ وقوع، اور دُوسرے کی تمام تر ایسی تفصیلات جو گزوں اور انچوں میں ماپی جا سکتی تھیں ماپ کر بیان کرتا جا رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل پنسل کے ساتھ اُس رجسٹر نما کاپی کے ایک صفحے پر جائے واردات کا مکمل نقشہ بنانے اور فیتے والے کانسٹیبل کے بتائے ہوئے ہندسوں کو اُس نقشے کے اندر مناسب جگہوں پر لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ کام ختم کر کے تھانیدار نے فیتے والے سپاہی کی مدد سے کمرے کی ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ چوکی کو اُٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا، چوکی پوش اور زمین پر بچھی ہوئی دری کو جھاڑا، دیواروں کو ٹھونک بجا کر اور کونوں کھدروں میں جمی ہوئی مٹی کو چھڑی کی نوک سے کھرچ کھرچ کر دیکھا، لیمپ کو کھول کر اندر نگاہ ڈالی۔ پھر اُس نے الماری کا تالا کھلوا کر ایک ایک بوتل، شیشی، مرتبان، پیالے، دواؤں کی پڑیاں، گٹھے، غرضیکہ ہر چیز کو نکلوا کر زمین پر ڈھیر کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ اُوپر کے خانے میں بغور اُس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں گرد میں بندوق کے ڈبے کا نشان موجود تھا۔ پھر اُس نے خالی الماری کو اُٹھوا کر ایک طرف کو رکھوایا اور اُس کے نیچے اور عقب کی زمین کو، جہاں برسوں کی مٹی اور جالے جمع تھے، صاف کروا کے اچھی طرح دیکھا۔ اس طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد

تھانیدار نے الماری واپس اپنی جگہ پر رکھوائی، اور اس کے کہنے پر سپاہی نے سب چیزوں کو اُٹھا کر الماری میں اِدھر اُدھر بھر دیا۔ پھر تھانیدار نے الماری کو تالا لگایا اور چابی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ چناروں کے نیچے دو چارپائیوں کے بیچ ایک لمبی سی چوکی بچھائی گئی جس کے اوپر کھانا لا کر رکھا گیا۔ مرغی کا سالن اور سفید چاول۔ دودھ کے لمبے لمبے جستی گلاس۔ کھانا صرف پولیس کے چار آدمیوں نے کھایا۔ گاؤں کے سب لوگ، بڈھے معتبروں سمیت، خاموشی سے چارپائیوں پر اور نیچے زمین پر بیٹھے رہے۔ کھانے کے دَوران تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل چند معتبر لوگوں سے اِدھر اُدھر کی، گاؤں کی، حکیم کی، مویشیوں کی، چیزوں کے بھاؤ کی، ڈوگرا کشمیر کی اور فوجیوں کی، شیر کی اور نمک کی باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھلے اور خلال کیے گئے۔ پھر تھانیدار نے ایک گالی دے کر سب فالتو لوگوں کو احاطے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ صرف چار بڈھے، ولی چوکیدار، اور بڈھوں کی سفارش پر گاؤں کے تین چار اور لوگ احاطے میں رہ گئے۔

بڈھوں کے بیانات مختصر اور بے سُراغ تھے۔ ولی چوکیدار نے کہا کہ وہ وقوعے سے آدھ گھنٹہ قبل اپنے چکر پر اِدھر سے گزرا تھا، اس وقت مطلب میں زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس پر تھانیدار گالی دے کر بولا کہ "وقوعے کے آدھ گھنٹے کے بعد بھی مطلب میں زندگی کا کوئی نشان نہ تھا، اور اسی لیے تو وہ تین میل سے اُٹھ کر وہاں آیا تھا۔" اور "کیا تیری ماں کے نکاح میں شریک ہونے آیا ہوں؟" تھانیدار کے اس مذاق پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ پھر ایک شخص کو بھیج کر اطلاع کی گئی کہ تفتیشی افسر گھر میں آنا چاہتے ہیں۔ ایک سپاہی کو خالی احاطے میں چھوڑ کر تھانیدار، ہیڈ کانسٹیبل اور دُوسرا سپاہی گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ اس دوران میں اسد یاسین کو بتا چکا تھا کہ بندوق کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، بندوق اب شاید اُن کے کام آئے۔ اُس نے یہ بھی تاکید کی کہ وہ بندوق کا ڈبّہ اپنے کمرے سے اُٹھا لائے اور اپنے باپ کی چارپائی کے نیچے رکھ دے۔ یہ موزوں جگہ تھی۔

گھر کے چھوٹے سے صحن میں میز اور کُرسی رکھی گئی۔ ایک دُوسری کرسی اور چارپائی گھر کے اندر سے لا کر بچھائی گئی۔ تھانیدار نے اسد کو اپنے مقابل چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سوالات شروع ہوئے:

"نام؟"

"اسد کریم۔"

"ولدیت؟ قوم؟ سکونت؟"

"حسن کریم۔ فنش آباد، ضلع گجرات، پنجاب۔"

"قوم؟" تھانیدار نے دہرا کر پوچھا۔

"پٹھان۔"

"پنجابی پٹھان؟"

"ہاں۔"

"اصلی یا نقلی؟" تھانیدار نے مذاقاً کہا۔

"پتا نہیں۔" اسد تھانیدار کے لہجے سے جھنجھلا گیا۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اچھا آ — ؟" تھانیدار بولا۔ "فرق کیوں نہیں پڑتا؟"

"ان باتوں کا کوئی ثبوت تو ہوتا نہیں۔"

"ثبوت تو بہت سی چیزوں کا نہیں ہوتا۔" تھانیدار دوسرے پانچ آدمیوں کی جانب دیکھ کر دانائی سے ہنسا۔ "لیکن کئی باتوں کا آدمی کو علم ہوتا ہے جن سے اُس کی شناخت ہوتی ہے۔ آپ کو کبھی اپنے والدین یا دوسرے رشتہ داروں نے ایسی باتیں نہیں بتائیں مثلاً آپ کی ذات کیا ہے، کہاں سے آئے ہیں، آباء و اجداد کون تھے، کیا کرتے تھے، وغیرہ؟"

"بتائی تھیں۔"

"آپ نے اُن سے ثبوت مانگا تھا؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

اسد نے جزبز ہو کر جواب دیا: "بہت سی غلط ثابت ہوئیں۔"

تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل کی آنکھوں میں حیرت اور استہزا کا ملا جلا اثر تھا جیسے انہیں اسد کی عقل پر شبہ ہو رہا ہو۔ کچھ دیر تک اسی طرح بغور اُسے دیکھتے رہنے کے بعد تھانیدار نے لمبا سا "ہوں" کرتے ہوئے ایک بار — پھر دوسری بار اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بعد تھانیدار نے احتیاط سے ایک پنسل چُنی اور رجسٹر کھول کر اُس کے اندر چند الفاظ درج کیے، جیسے یادداشت کے لیے لکھ رہا ہو۔ جب دوبارہ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو تھانیدار کا لہجہ بدلا ہوا تھا:

"یہاں کب آئے؟"

"پچھلے سال گرمیوں میں۔"

"صحیح تاریخ؟"

"چھبیس جولائی۔"

"کیوں؟"

"جی؟"

"کیا مقصد لے کر آئے؟"

"علاج کی خاطر۔"

"کس بیماری کے علاج کے واسطے؟"

"سانس کی بیماری۔"

"دمّہ؟"

"اسی قسم کی بیماری ہے۔"

"منفوّل نے تمہارا علاج کیا؟"

"جی ہاں۔"

"کیا یہ درست ہے کہ چند ماہ تک علاج کرانے کے بعد تم کچھ عرصے کے لیے گمشدہ چلے گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

تھانیدار نے رجسٹر میں دو چار لفظ لکھتے ہوئے اونچی آواز میں اپنے آپ سے دہرایا، 'درست ہے۔'

پھر بولا، "اپنے گھر گئے تھے؟"

"ہنہہ؟"

"جب تم کچھ عرصے کے لیے یہاں سے گئے تو کیا اپنے گھر واپس گئے؟"

"نہیں۔"

"پھر کہاں گئے؟"

"گجرات۔"

"تمہارے علاقے کا شہر ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہاں کس کے پاس گئے؟"

"ایک دوست کے پاس۔"

" وہاں سے تمہارا گاؤں کتنی دور ہے ؟"

" کوئی پندرہ بیس میل ۔"

" تو وہاں سے تم اپنے گاؤں نہیں گئے ؟"

" نہیں ۔"

" ایک دن کے لیے بھی نہیں ؟"

" نہیں ۔"

" کیوں ؟"

" گھر میں صرف میرے ایک چچا رہتے ہیں ۔"

تھانیدار کڑی نظروں سے ایک منٹ تک اسے دیکھتا رہا ، جیسے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو ۔

" تم کتنا عرصہ وہاں رہے ؟"

" دو ہفتے ۔ آپ یہ سوالات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

تھانیدار نے جواب دیے بغیر سوالات جاری رکھے : " کیا تم اس لیے چھوڑ کر چلے گئے تھے کہ علاج تمہاری تسلی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا ؟"

" ان سوالوں کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے ؟"

" ان باتوں کا فیصلہ کرنا میرا کام ہے ۔" تھانیدار نے کہا ، " یہ قتل کی تفتیش ہے ، کوئی چوری چکاری کا معاملہ نہیں ۔ میں سوال دہراتا ہوں ۔ کیا پہلی بار تم گنڈ چھوڑ کر اس وجہ سے چلے گئے تھے کہ تمہارے خیال کے مطابق علاج تسلی بخش نہیں ہو رہا تھا ؟"

" جی ہاں ۔"

تھانیدار نے اس بار لکھے بغیر ہاں میں سر ہلایا ، اور بولا ، " درست ہے ۔ تو پھر دو ہفتے کے بعد واپس کیوں آ گئے ؟"

" بیماری بگڑ گئی تھی ۔"

" جب تمہیں کوئی آرام ہی نہیں آیا تو حالت بگڑ کیسے سکتی ہے ؟"

" میں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی آرام نہیں آیا ۔ کچھ نہ کچھ افاقہ ہوا تھا ۔"

"اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ واپس یہاں آکر بہتر ہو جائے گی؟"

"اس کے سوا چارہ نہ تھا۔" اسد نے کہا۔

"کیسے؟"

"مجھے حکیم کی دوائی سے کافی افاقہ ہو جاتا تھا۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ کچھ نہ کچھ افاقہ ہوا تھا۔ اب کہہ رہے ہو کہ کافی افاقہ ہو جاتا تھا۔ ان میں سے کون سی بات درست ہے؟"

"اس بیماری میں جو بھی افاقہ ہو وہی غنیمت ہوتا ہے۔"

"پھر تمہاری بے اطمینانی کا سبب کیا تھا؟"

"میرا خیال تھا کہ حکیم صاحب کوشش سے میرا علاج نہیں کر رہے۔"

تھانیدار کے منہ سے ایک بھونک کی طرح کی خشک سی آواز نکلی جو اس کی استہزائی ہنسی تھی۔ اُس نے کہنیاں میز پر رکھیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ پنسل کو ہوا میں اٹھا کر اُس کے سِکّے کو گھورتے ہوئے بولا:

"کیا یہ درست ہے کہ جب تم دوبارہ یہاں آئے تو اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد حکیم کے گھر میں تمہارا آنا جانا شروع ہو گیا تھا؟"

"جی۔"

"درست یا نادرست؟"

"درست ہے۔"

"جب کہ اور کسی مریض کو کبھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔"

"پتا نہیں۔"

"ہُنہہ؟"

"مجھے علم نہیں کہ کبھی کسی اور کو یہ شرف حاصل ہوا یا نہیں۔"

"گھر کے اندر تمہاری اس حیثیت کے حصول میں کس بات کا عمل دخل تھا؟"

"مجھے علم نہیں۔" اسد نے کہا، "میرا نہیں خیال۔"

"کیا مقتول کے دل میں تمہارے واسطے کوئی خاص جگہ پیدا ہو گئی تھی؟"

"ہو سکتا ہے۔" اسد نے کہا، "مجھے علم نہیں۔"

"کیا مقتول نے کبھی کسی اور طریقے سے اس کا اظہار کیا تھا ؟"

اسد ایک سیکنڈ کو رکا، پھر بولا : "ایک بار حکیم نے ذکر کیا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اُن سے طب سیکھ سکتا ہوں۔"

"پھر کیا مقتول نے آپ کو طب سکھائی ؟"

"نہیں۔"

"مگر تمہاری خواہش تھی کہ طب کا علم حاصل کرو ؟"

"نہیں۔"

"کیا یہ درست ہے کہ اس گھر میں یہ حیثیت ملنے کے فوراً بعد تم نے مقتول کے گھرانے کے ایک فرد کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے ؟" اسد نے تیزی سے مُڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ پولیس والوں کی توجہ اُس پہ مرکوز تھی، جب کہ بڈھے خلا میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔

"اس کا کیا تعلق ـــ" اسد نے کہنا شروع کیا، مگر تھانیدار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تعلق ہے یا نہیں، مگر سوال اپنی جگہ پر اہم ہے۔ مہربانی فرما کر جواب دو۔"

کچھ دیر کے بعد اسد نے کہا : "ہاں۔"

"ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟"

"کوئی خاص نہیں تھی۔"

"کوئی خاص سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

"سیدھی سادی تھی۔"

"اسد کریم، دماغ کو صاف کر کے جواب دو۔ میں سوال دہراتا ہوں۔ اِن تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟"

"ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔"

"بہت پسند کرتے تھے ؟"

"پسند کرتے تھے۔" اسد نے دہرایا۔

"یہ تعلقات کس حد تک بڑھ چکے تھے ؟"

"کسی حد تک نہیں بڑھے تھے۔" اسد نے کہا۔ "سیدھے سادے تھے۔"

"سیدھے سادے کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟" تھانیدار نے سختی سے کہا۔

اسد خاموشی سے اُس کا مُنہ تکتا رہا۔

"مقتول کا اس بارے میں کیا خیال تھا؟"

"کس بارے میں؟"

تھانیدار نے صبر سے آہستہ آہستہ دہرایا: "مقتول کو آپ کے ان تعلقات کا علم تھا؟"

"پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے ہو۔ ہوسکتا ہے نہ ہو۔"

"کیا آپ دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے کبھی یہ کوشش کی گئی کہ یہ بات مقتول کے علم میں لائی جائے؟"

"نہیں۔"

"کیا ایسا کرنے کا آپ ارادہ تھا؟"

"ہاں۔"

"تمہارے خیال میں تمہاری اس حرکت پر مقتول کا ردِ عمل کیا ہوتا؟"

"میرے خیال میں وہ اس پر معترض نہ ہوتا۔"

"گویا آپ کو اُس کی پُشت پناہی حاصل ہو جاتی؟"

"ہاں۔"

تھانیدار کئی لمحوں تک آنکھیں نکالے اُسے دیکھتا رہا، جیسے اپنی ٹکٹکی کے زور سے اسد کو اپنا بیان واپس لینے پر مجبور کر دینا چاہتا ہو۔ پھر بولا:

"مقتول کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا تھی؟"

"اُس کے بارے میں میری کوئی ذاتی رائے نہ تھی۔"

"ہوش حواس قائم کر کے جواب دیجیے۔ مقتول کے متعلق تمہاری ذاتی رائے کیا تھی؟"

"یہ ضروری نہیں کہ کسی کے بارے میں میری ذاتی رائے ہو۔" اسد نے کہا۔

"حکیم تمہارے لیے ہر کوئی تھا؟ ناواقف تھا؟ جیسے میں ہوں یا یہ ہے یا یہ ہے؟"

اسد اُس کی درشتی پر چونک کر اُس کا مُنہ تکنے لگا۔

"جواب دو۔"

کچھ دیر کے بعد اس نے جواب دیا: "حکیم ایک عجیب سا آدمی تھا۔"